معاصر اردو ناول اور ناول نگار-1

اردو ناول نگاری کا سفر ڈیڑھ سو برسوں سے زیادہ سے جاری ہے۔ اس بیچ کئی اتار چڑھاؤ آئے۔ ادب کی سمت اور رفتار بدلتی رہی جس کے ساتھ ساتھ ناول بھی اپنی شکل تبدیل کرتا رہا۔ آج جدید تکنیک اور جدید ذرائع ابلاغ کی وجہ سے عالمی سطح پر ادب میں یکسانیت آئی ہے۔ ایک زبان کا ادب دوسری زبان کے ادب کے قریب آیا ہے۔ ادب میں ہو رہے تجربوں تک رسائی آسان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ پچیس تیس برسوں کا معاصر اردو ناول بھی پہلے سے بہت مختلف ہے۔ بقولِ انور پاشا کے:

> ''معاصر ناول کا اصل سفر اس نسل کے ساتھ شروع ہوتا ہے جس نے 85-1980 کے بعد ناول نگاری کے میدان میں قدم رکھا اور گزشتہ ڈیڑھ دو دہائیوں میں اپنی شناخت بطورِ ناول نگار قائم کی ہے۔ اس نسل سے تعلق رکھنے والے ناول نگاروں نے اپنے ناولوں کے ذریعے اردو ناول نگاری کے افق کو وسعت عطا کرنے میں نمایاں کردار عطا کیا ہے۔ ان کے ناول فکری و موضوعی معنویت کے اعتبار سے اپنے پیش روؤں سے مختلف اور عصری تناظر کے ساتھ مکمل طور پر ہم آہنگ ہیں۔ ان کے یہاں ماضی کے بجائے حال اور صرف حال کا سیاق غالب ہے۔ انھوں نے اردو ناول کو عصری زندگی کے بعض ایسے گوشوں سے آشنا کیا ہے جو اب تک ہماری توجہ کا مرکز نہیں بن پائے تھے۔''

پچھلے کچھ برسوں سے جدید ذہن کے کئی ناول نگاروں نے اپنی اپنی دلچسپی کے تحت منتخب موضوعات پر ناول نویسی کر کے اردو ناول کے دائرہ کو وسیع سے وسیع تر کرنے کی سعی کی ہے جن میں عبد الصمد، حسین الحق، مشرف عالم ذوقی، پیغام آفاقی، علی امام نقوی، کشمیری لال ذاکر، غضنفر، شموئل احمد، شبرؔ امام، تنویر جہاں، علی امام نقوی، اور محمد علیم، شمس الرحمن فاروقی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

موجودہ دور کی فکشن تاریخ میں عبد الصمد ایک معتبر نام ہے۔ ان کے اب تک کئی افسانوی مجموعے اور ناول شائع ہو چکے ہیں۔ دو گز زمین، خوابوں کا سویرا، مہاتما، مہاساگر، شکست کی آواز اور دھمک عبد الصمد کے وہ ناول ہیں جن سے اردو ناول کی تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے۔ دو گز زمین نہ صرف عبد الصمد بلکہ اردو ادب کا ایک شاہکار ناول ہے جس میں 1947ء کے فرقہ وارانہ فسادات اپنی تمام ہولناکیوں کے ساتھ موجود ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں ہجرت کا سانحہ بڑے مؤثر طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔ یہ ناول بظاہر ایک خاندان کی کہانی ہے لیکن عبد الصمد نے اپنے فن کارانہ شعور اور تخلیقی رویے

سے اس کو برصغیر کے کم و بیش ہر اس خاندان کی داستان کے طور پر پیش کیا ہے جو تقسیم وطن کی خونی موجوں کی زد میں آیا ہے۔ اس حوالے سے نور الحسنین لکھتے ہیں کہ:

> ” دیکھا جائے تو یہ کہانی صرف بہار میں آباد کسی اختر حسین کی نہیں ہے بلکہ آزادی کے بعد یہاں رہنے والے سبھی مسلمانوں کی ہے۔ عبد الصمد نے اس ناول میں اسی کرب کو اجاگر کیا ہے۔ یہاں رہنے والے مسلمان خواہ مخواہ مشکوک ہیں تو وہاں جانے والے مسلمان بھی ابھی تک مہاجر کے لقب کا عذاب برداشت کر رہے ہیں۔“

مہاتما عبد الصمد کا وہ ناول ہے جس میں عصر حاضر کے ایک اہم مسئلے ' تعلیمی نظام کی بگڑی ہوئی صورت حال ' کو موضوع بنایا گیا ہے۔ آج کا تعلیمی نظام اقتدار پرست اور تاجرانہ ذہن کے مالک افراد کے ہاتھوں کھوکھلا بن چکا ہے۔ اس ناول میں مصنف نے اگرچہ صوبۂ بہار کی تعلیمی بد عنوانیوں اور وہاں کے دولت مند ٹھیکے داروں کی خود غرضانہ چالوں کا پردہ فاش کیا ہے لیکن اس کے پس پشت پورے ملک میں قائم نامور کالجوں، یونیورسٹیوں اور دوسرے علمی اداروں میں جڑ پکڑے اس مہلک مسئلے کو بھی ابھارا گیا ہے۔ ناول نگار نے مرکزی کردار راکیش کے سہارے یہ تاثر قائم کیا ہے کہ کس طرح موجودہ دور میں ایک محنتی، ذہین، ایمان دار اور اصولوں و آدرشوں کا پابند طالب علم بعض شر پسند افراد کی منافقانہ سازشوں سے بے ضمیری اور غیر اخلاقی راہ اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس اعتبار سے ناول اور ناول نگار نے ضرور چونکا دیا ان کی تحریروں میں صرف مواد بلکہ پیش کش کی سطح پر بھی شگفتگی کا احساس ہوتا ہے۔ ناول میں نہ عشق کی پھیلی ہوئی داستان ہے اور نہ ہی تاریخی ناولوں جیسی چمکتی ہوئی تلواریں ہر صفحے سے نمودار ہوتی ہیں بلکہ یہاں آج کی زندگی کے ایسے احول کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس میں چاہے متوسط طبقہ ہو، اعلی طبقہ ہو یا کسی اور طبقے کے انسانی نسل کی بیداری کی داستان ہو۔ اس عہد کو اس نظام سے گزرنا ہی ہو گا جو اس ناول میں بہت فطری انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یعنی آج کے موجودہ تعلیمی نظام کی گرتی ہوئی صورت حال کے لئے انہوں نے جن کرداروں کو سوالوں کے حصار میں قید کیا ہے ان میں سیاست داں۔ والدین۔ طلباء۔ اساتذہ۔ قابل ذکر ہیں۔ اس میں ایک کردار ہے جو فرسٹ کلاس میں ایم اے کرنے کے بعد پروفیسر پرساد سے اپنے مستقبل کے بارے میں باتیں کرتا ہے دو راستے اس کے پیش نظر ہیں۔ ایک سول سروس میں جانا اور دوسرا کالج کا ٹیچر ہونا۔ شاید راکیش کے ذہن میں کہیں نہ کہیں یہ بات ہی تھی کہ سول سروس میں وہ زیادہ کامیاب ہو سکتا ہے۔ اس لئے پروفیسر کے سامنے وہ اپنی بات یوں رکھتا ہے کہ پروفیسر پرساد کا تعلق جس نسل سے ہے اور راکیش جس نئی پود سے تعلق رکھتا ہے دونوں کی فکری جدوجہد میں بہت تبدیلیاں ہو چکی ہیں۔ ناول نگار جس سسٹم کی بات راکیش کے حوالے سے کرنا چاہتا ہے ناول کا مرکزی خیال بھی وہی ہے۔ ایسے میں جب یہ حادثہ رونما ہو جاتا ہے

کہ لیکچرر کے عہدے کے لئے شعبہ سیاسیات میں سب سے اچھی درخواست ہونے کے باوجود راکیش کو اس عہدے کے لیے نہیں چنا جاتا ہے۔ عبدالصمد نے اسی موقع پر ایک اسی نسل کے آئیڈیل کردار پروفیسر پرساد کو موت سے ہم کنار کیا۔ پروفیسر بھی اس کے لیے صحیح معنوں میں ایک موہوم سی امید تھے۔ جب راکیش کی فیلوشپ بھی ختم ہوئی تو آمدنی کا یہ ذریعہ بھی ختم ہوا۔ اب کردار میں تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں ناول نگار نے بہت فطری انداز میں اس کے جدوجہد کو ٹھیک اسی انداز میں بیان کیا ہے جس سے موجودہ عہد کے ایسے اشخاص روز گزرتے ہیں۔ کردار کو پینٹ کرتے وقت عبدالصمد نے اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ وہ بتدریج فطری طور پر بدلے یہاں کچھ بھی تھوپنے یا خواہ مخواہ کی آئیڈیالوجی کی بات نہیں کی گئی ہے۔ ناول میں وہ مقام بھی آتا ہے جب راکیش کو یہ احساس ہونے لگا کہ وہ اسی سمندر کی مچھلی ہے۔ جہاں سے اسے نکال کر پھینکا گیا تھا۔ ایک طرف پروفیسر پرساد کا آئیڈیل کردار مرچکا تھا تو دوسری طرف ڈاکٹر سنہا جیسے لوگ بھی تھے۔ اگر کوئی ایسا کردار ابھر کر سامنے نہ آئے تو شاید سوچ اور بھی بے ترتیب ہو کر کوئی تخریبی رخ اختیار کرلے۔ راکیش کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ اپنی صلاحیتوں کے باوجود اپنی ڈگری کے بل بوتے پر صحیح مقام حاصل نہیں کرسکا۔ ڈاکٹر سنہا نے راکیش کی صلاحیتوں اور اس کی ناکامیوں کو مقصد دیا۔ جینے کا مقصد۔ لیکن یہاں سے کردار زوال کی منزل کی طرف بڑھنے لگتا ہے جہاں سے اس کا کسی طرح لوٹنا مشکل تھا۔ عبدالصمد نے ناول کے اس موڑ پر آکر لاشعوری طور پر ایک ایسا اعلان بھی کردیا ہے جس کا اندازہ قاری کو اس وقت ہوتا ہے جب وہ اپنے شعور کی رو میں بہتے ہوئے اچانک راکیش کے آئیڈیل کردار کو پیچھے چھوڑ کر ایک نئے راکیش کے ساتھ بہت آگے نکل چکا ہوتا ہے۔ ناول کئی اعتبار سے دعوت فکر دیتا ہے اور بہت بے باک رویئے کے ساتھ قاری کے سامنے آتا ہے۔

حسین الحق کا پہلا ناول بولو مت چپ رہو جنریشن گیپ اور بدلتے ہوئے تہذیبی و معاشرتی اقدار سے پیدا شدہ صورت حال کو موثر انداز میں گرفت میں لاتا ہے۔ اس ناول میں مصنف نے آج کے تعلیمی نظام کی تبدیلیوں اور شاہی افراد کی خود غرضیوں اور غلط اندیشیوں کو موضوع بنایا ہے۔ فرات حسین الحق کا دوسرا اور مقبول ناول ہے، اس میں انہوں نے ماضی کے پس منظر میں جدید عہد میں ذات پات سے طبقاتی کشمکش، سیاسی اور سماجی بے راہ روی، مسلمانوں کی زبوں حالی، اخلاقی و روحانی قدروں کی شکست وریخت وغیرہ جیسے مسائل کی پیش کش کی ہے۔ یہ ایسے لوگوں کی کہانی ہے جو چھوٹی چھوٹی خواہشات کے لیے زندگی میں پیش آنے والے مسائل اور اپنے جذبات واحساسات پورا کرنے کے لیے زندہ رہنے پر مجبور ہیں جو دریائے فرات کے کنارے پہنچ کر بھی پیاسے ہیں۔ حسین الحق نے اس ناول میں تین نسلوں کی زندگی کو سمیٹنے کی کامیاب سعی کی ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انور پاشا لکھتے ہیں کہ:

حسین الحق کا فرات معاصر ناولوں میں موضوعی اعتبار سے قدرے الگ جہتیں رکھتا ہے۔ یہ ناول جنریشن گیپ اور بدلتے تہذیبی و معاشرتی اقدار سے پیدہ شدہ صورتِ حال کو موثر انداز میں گرفت میں لاتا ہے۔ تین نسلوں کے درمیان موجود ذہنی بعد اور معاشرتی تہذیبی و اخلاقی قدروں کے تصادم سے ناول کا ہیولا تکمیل پاتا ہے۔ زبان و اسلوب میں رچاؤ اور چاشنی سادہ بیانیہ کو تازگی عطا کرتی ہے۔

حسین الحق کا تازہ ناول اماوس میں خواب ادبی منظرنامے پر نہایت ہی خوبصورتی کے ساتھ سامنے آیا۔ یہ بھی ادبی حلقوں میں موضوع گفتگو بنا ہوا ہے۔

علی امام نقوی بہت اچھی نثر لکھتے ہیں۔ حالانکہ ان کے کچھ ناولوں کو پڑھ کر یہ تاثر فوری طور پر نہیں ابھرتا۔ کیونکہ ان کے اکثر ناولوں میں مقامی بولی کا عنصر نمایاں ہوتا ہے۔ ناول کے نثر کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس کے مکالموں میں مقامی رنگ بے روک ٹوک آسکے۔ وہ بمبئی کے باہر کے عام متوسط طبقے اور نچلے طبقے کی زندگی اور معاشرت کی بھی بڑی عمدہ عکاسی کرتے ہیں۔ رسم ورواج اور مختلف طبقوں کی اصطلاحات کا حال پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں زندگی اور زندگی کے مظاہر سے کتنی دل چسپی ہے۔ علی امام نقوی کا تازہ ناول ہے بساط ۔ یہ ناول اگرچہ زیادہ ضخیم نہیں ہے لیکن اس کا کینوس نہایت ہی جامع اور وسیع ہے۔ یہ ناول ریاستِ جموں وکشمیر ے سیاسی تنازعات اور یہاں کے لوگوں کی بے کسی و بے بسی کو نہایت ہی مؤثر انداز میں بیان کرتا ہے۔ کشمیر کے اس الجھے مسئلے کو پیش کرنے اور اس کے پس پشت کارفرما عناصر کو پیش کرنے کے علاوہ یہاں کے لوگوں کے استحصال کی پوری تصویرکشی اس ناول میں بڑی فن کاری سے کی گئی ہے۔